مختار صدیقی کی شاعری میں تاریخ و تہذیب

ڈاکٹر شیراز فضل داد

Abstract

Mukhtar Siddiqui is an eminent poet of Halqa-e-Arbab-e-zouq. Sufisim, history, culture and classical music are the areas of his interest. He has various colours and shades in his poetry which he get from history. History and historical places take him in the past and he can feel and depict not only about the life of people in that time but also their feelings and their thoughts. He is very keen to know about the mistakes that caused the fall of glorious nations. In this article, historical perspective of his poems has been discussed.

ملخص

مختار صدیقی حلقہ اربابِ ذوق کے اولین ارکان میں سے تھے۔ تصوف، تاریخ، تہذیب وتمدن اور موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ تاریخ، تہذیب اور موسیقی کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ وہ اپنی نظموں میں تاریخ کے محض خارجی خدوخال بیان نہیں کرتے بلکہ وہ تاریخ کے جس دور کا ذکر کرتے ہیں اس کا تہذیبی مزاج اور باطنی آہنگ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی راگوں پر مشتمل نظموں کے پس منظر میں مغلیہ تہذیب وتمدن کا بھرپور نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ مختار صدیقی ماضی کی گم شدہ اقدار اور ماضی کے واقعات کو معاصر صورت حال کے ساتھ مربوط کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے میں مختار صدیقی کے تاریخی وتہذیبی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: مختار صدیقی، حلقہ اربابِ ذوق، جدید اردو نظم، منزلِ شب، سہ حرفی

مختار صدیقی کا شمار حلقۂ اربابِ ذوق کے ان اراکین میں ہوتا ہے جنھوں نے ابتدا ہی میں حلقے میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں جب میرا جی حلقے میں شامل ہوئے تو اسی سال مختار صدیقی بھی حلقے کے

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

رکن بن گئے۔۱۹۴۱ء میں حلقے کی جانب سے جو بہترین نظموں کا انتخاب ہوا اس میں مختار صدیقی کی نظم ''رات کی بات' بھی شامل تھی۔مختار صدیقی متعدد ادبی حیثیتوں سے جانے جاتے تھے۔ وہ مصنف، نقاد، ڈراما نگار، مترجم، ریڈیو کے سکرپٹ رائٹر اور سکرپٹ ایڈیٹر بھی تھے۔مختار صدیقی کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے ہر ادبی حیثیت میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ شاعری میں راگوں کے استعمال کے باعث ایک منفرد اسلوب متعارف کروایا۔

مختار صدیقی کی شاعری میں ان کی فکر کی کئی جہات نظر آتی ہیں۔ان کے کلام میں ان کی ذات اور زندگی کا ہر پہلو دکھائی دیتا ہے۔ان کی باطنی کیفیات اور جذبات کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کے تمام پہلو ان کی شاعری سے جھلکتے ہیں۔تصوف، تاریخ، تہذیب، فلسفہ، ملکی و بین الاقوامی صورتِ حال، معاشرتی و سماجی مسائل، ظلم، جبر، اقتصادی مسائل، وطنیت، حب الوطنی، جنگ اور اس کی تباہ کاریاں غرض زندگی کا کوئی پہلو ان کی شاعری سے خارج نہیں ہے۔ادب کے متعلق مختار صدیقی نے اپنا ایک نظریہ مرتب کیا۔ وہ ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' میں سے کسی ایک نظریے کے قائل نہیں ہیں بلکہ دونوں نظریات کو ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ منزل شب کے دیباچے میں انھوں نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔مختار صدیقی کے ہاں ہمیں مختلف اور منفرد نوعیت کے تجربات ملتے ہیں۔راگوں پر مشتمل نظمیں لکھنے کا منفرد تجربہ کیا نیز تصوف کے مضامین کے لیے سی حرفی کی صنف کو اختیار کیا۔ان کے تین شعری مجموعے ہیں۔منزلِ شب، سی حرفی اور آثار۔مختار صدیقی کی نظم کے حوالے سے سعادت سعید لکھتے ہیں:۔

> ''ان کی شاعری میں ایک ایسے پر اسرار کرب کی نشان دہی ہوتی ہے جس کے سوتے ان کی جذباتی دوز اویہ نظر سے پھوٹتے ہیں۔اشیا کا مطالعہ اور مشاہدہ ان کے ہاں ایک خواب آلود تازگی کے سیاق وسباق میں ڈھلتا ہے جو ان کے لیے شعری تخلیق، آسودگی اور مسرت بہم پہنچاتے کا ذریعہ بنتا ہے۔''[۱]

مختار صدیقی کا تاریخی اور تہذیبی شعور بہت پختہ ہے۔وہ جب اپنی نظموں میں تاریخ کو پیش کرتے ہیں تو محض تاریخ کے خارجی خدوخال نہیں دیکھتے بلکہ تاریخ کے اس مخصوص دور کا تہذیبی مزاج اور باطنی آہنگ بھی پیش کرتے ہیں۔انھوں نے راگوں پر جو نظمیں تخلیق کیں ان کے پس منظر میں مغلیہ تہذیب وتمدن کا پورا نقشہ دکھائی دیتا ہے جیسے نظم ''خیال درباری'' میں اکبر اعظم کے دربار کا پورا نقشہ، اہلِ دربار، ان کے ملبوسات اور ان کی شان وشوکت کو نظم کیا ہے۔اکبرِ اعظم کا محل سونے چاندی سے مزین ہے ہر طرف فانوس اور شمعیں جگمگا

رہی ہیں اور اہلِ دربار خوبصورت ملبوسات میں ملبوس نگاہیں جھکائے، ہاتھ باندھے اکبر اعظم کی آمد کے منتظر ہیں۔

آلِ تیمور کے سورج کی تجلی پھیلی
دکھ درد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگے
وہ اجالا ہے کہ جُگ جُگ کے نصیبے جاگے
اے ری جُگ جُگ کے نصیبے جاگے!
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے ہیں ۔ دیکھو
ترکمان حجرتِ اکبر آیو.....حجرتِ اکبر آیو ۲

اس نظم کے حوالے سے مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''.....تین سو برس کی طنابیں کھینچتی ہیں تو انسان دربارِ اکبری میں جا پہنچتا ہے اور ہم مغلیہ عمارات کے پس منظر میں ''حجرتِ اکبر آیو'' کا ڈرامہ راوی کی زبان سے سنتے ہیں مگر یہ راوی محض نشریات کا راوی نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت ہے اور اس کے اپنے مسائل بار بار دربارِ اکبری کی فضا سے ٹکراتے ہیں۔'' ۳

نظم ''سمندر'' میں بھی مغل تہذیب کو موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ڈرامائی انداز میں مغل سلطنت کو اپنی تمام شان وشوکت اور جاہ وجلال سمیت سمندر میں غرق ہوتے دکھایا ہے۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سلطنت چھن جانے کے بعد جلاوطنی کے عالم میں جس طرح تڑپ تڑپ کر موت کا انتظار کر رہا ہے اس کیفیت کو انھوں نے اپنے تجربے کا حصہ بنایا اور اس تجربے میں اپنے قارئین کو بھی شامل کیا۔ سمندر میں غرق ہو جانے کو انھوں نے زوال کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، کیونکہ یہی وہ وقت اور مقام ہے جہاں سے برصغیر کے مسلمانوں کا عروج زوال میں بدل گیا تھا۔ اس سے قبل مغل حکمرانوں کی نااہلی اور بدانتظامی کے باعث حکومت اپنے اختیارات کو کافی حد تک محدود کر چکی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح یہ بیڑا رینگ رینگ کر چل رہا تھا لیکن جب اس پر بھی حکمرانوں کو ہوش نہ آیا تو پھر ایسی ذلت کا سامنا کرنا پڑا جس کے بعد بحالی کے کوئی امکانات نہ تھے اور خود ہمارے حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں سے سلطنت غیروں کے حوالے کر دی۔ صفدر میر، مختار صدیقی کے تاریخی وتہذیبی شعور اور تصورِ زمان ومکاں کے حوالے سے کہتے ہیں:

''مختار صدیقی جدید شاعروں میں سب سے زیادہ بالغ اور زمان ومکاں کی گتھیوں سے آگاہ شخصیت کا مالک ہے.....راگ والی نظموں میں زمانہ وسطیٰ کے ہندوستان میں مغل راجپوت تہذیب کے عشق کے رومانوی

تصور کا نقشہ ہے جو شاعر کی قادرالکلامی کا ایک مظہر بھی ہے۔''۵

نظم ''موہن جو داڑو'' اور ''ٹھٹھہ'' میں بھی تاریخی وتہذیبی پہلو بہت نمایاں ہے۔مختار صدیقی تاریخی عمارات، ماضی کی گمشدہ اقدار اور ماضی کے واقعات کو ایسے نظم کرتے ہیں کہ وہ معاصر صورتِ حال کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں۔موہن جو داڑو اور ٹھٹھہ کے کھنڈرات اسلامی طرزِ تعمیر کے نشانات کے طور پر موجود ہیں۔ مختار صدیقی ان کھنڈرات کے ذریعے حال سے ماضی کا سفر کرتے ہیں اور ماضی میں جا کر ان تہذیبوں کو بنظرِ غائر دیکھتے اور اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر اس ماضی کو اپنے حال میں لا کر معاصر صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں۔صفدر میر لکھتے ہیں:

> ''''موہن جو داڑو'' اور ''ٹھٹھہ'' اس کی نظموں میں ایک نئی سمت ہے۔''موہن جو داڑو'' تو خیر ایک چلتی ہوئی ریڈیائی تمثیل ہے لیکن ''ٹھٹھہ'' میں زمان ومکاں کی اضافیت اور کائنات کے معنی پر گہری سوچ کے آثار پائے جاتے ہیں۔یہاں پر شاعر ایک مثبت نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''۵

پھر میرے سامنے آتی ہیں وہ پچھلی راہیں
جو یہ کہتی ہیں کہ '' راہوں سے ہی نکلی راہیں ''
جرسِ گل پہ رواں قافلۂ موسم ِ گل
ہر خزاں ڈھونڈتی پھرتی ہے اسی کی راہیں
'' زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است''
اپنے حیلوں ہی سے موت کی لٹتی راہیں
راہیں منزل تو نہیں ہیں کہ اجڑ کر نہ بسیں
زیست کی طرح سنورتی ہی رہیں گی راہیں ! ۶

نظم ''موہن جو داڑو'' میں شاعر نے تمثیلی انداز اختیار کرتے ہوئے دو روحوں کا مکالمہ بھی دکھایا ہے جس میں ان دونوں روحوں کے ذریعے ماضی کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔سیاحوں کی نظریں کھنڈرات کے ظاہری خدوخال دیکھتی ہیں۔شاعر نے ان روحوں کے ذریعے ان کھنڈرات میں چھپے جذبات کو پیش کیا ہے اور تہذیب کا باطنی رُخ دکھایا ہے۔شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان کھنڈرات میں جب زندگی موجود تھی تو زندگی کا ڈھب کیا تھا؟ لوگ کیسے جیتے تھے؟ خوشیاں اور غم کیسے ہوتے تھے؟ خالق ومخلوق کا رشتہ کس نوعیت اور کا انداز کا تھا۔عموماً جب کھنڈرات کی بات کی جاتی ہے تو وہاں کی عمارات، ملبوسات، زیورات اور ظروف وغیرہ پر توجہ دی جاتی

ہے۔اس بات پر غور نہیں کیا جاتا کہ ان کھنڈروں میں بسنے والے کیا سوچتے تھے، کیا محسوس کرتے تھے اور کیسے زندگی بسر کرتے تھے۔مختار صدیقی کو موہن جو داڑو، اور ٹھٹھہ کی تہذیب اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہ تہذیب ان کی اپنی دھرتی کی ہے۔وہ خود کو اس تہذیب کا وارث سمجھتے ہیں۔وہ اس تہذیب کے عروج وزوال کو اس لیے سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس سے آنے والوں کی زندگی کو بہتر بنایا جا سکے، اور وہ عناصر جو ان شان دار تہذیبوں کے زوال کا باعث بنے آئندہ ان سے بچنے کی کوشش کی جائے۔شاعر نے کھنڈرات کو محض تباہی وبربادی اور ویرانی کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ اس میں ایک مثبت پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اس دھرتی پر انسانی تہذیب کبھی اتنے عروج پر بھی تھی اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم اس عظیم تہذیب کے وارث ہیں۔ہماری تہذیب کی جڑیں بہت گہری اور بنیادیں مضبوط ہیں۔

اب یہ روحیں نہیں ان پچھلے گھروندوں کی اسیر
جن سے وادی شاداب، تمدن کی شرف گاہ رہی
یہ تمدن بھی نہاں خانہ، ماضی کا نہیں زندانی
عصرِ حاضر کی یہ میراث ہے
اب میرے وطن کی میراث!!
ہمیں ہیں اس کے حقیقی وارث کہ ہم نے پائے ہیں
اپنی آنکھوں سے بھی لگائے ہیں، یہ گم شدہ خزائن
وطن کی پارینہ عظمتوں کے
یہ ارضِ مشرق کے
نوعِ انساں کے اولیں اوج کے مدائن!![۷]

مظفر علی سید کے مطابق:

''وطن کی پرانی عظمت کے ان اجڑے ہوئے مدائن میں حال سے دور جانے کی خواہش کو بھی قرار ملتا ہے۔اور پھر اسی بہانے اس دوری کا رابطہ زمانہ حال سے بحال ہوتا ہے.....موہن جو داڑو کی ماقبلیاتی تہذیب اور ٹھٹھہ کی اسلامی عمارات ومحلات جو اب بے حد شکستہ حالت میں ہیں۔بیسویں صدی کے تماش بینوں اور زائرین کے پیشِ نظر میں ایک تضاد یہ روپ پیش کرتے ہیں۔یہاں مختار عتیقات کے نقطۂ نظر سے ایک نثری پروگرام نہیں لکھ رہے بلکہ اپنے مسائل اور نئی پرانی زندگی کے سہارے اور موازنے کو موضوع بحث بنا کر ایک شعری

اندازِ نظر اختیار کر رہے ہیں۔''۸

مختار صدیقی کے تاریخی وتہذیبی شعور میں ایک تسلسل دکھائی دیتا ہے اور وہ تاریخ کے اس تسلسل میں انسان کی مختلف نسلوں کو دیکھتے ہیں جو کبھی جنگ کا نشانہ بنیں، کبھی اپنے ہی قائدین کی غلط تدبیروں کے باعث تباہ ہوگئیں اور کبھی تقدیر نے ان کے ساتھ ایسا کھیل کھیلا کہ ان کے نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ نسلوں سے انسان مسلسل جدو جہد کر رہا ہے، کبھی اقدار کو بدلتا ہے، کبھی نصاب بدلتا ہے، ترقی کرنے کے لیے ہر طرح کے جتن کر رہا ہے، لیکن ہر عہد کا انسان کسی نہ کسی سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور اس کے سارے جتن سارے حیلے رائیگاں جاتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی مختار صدیقی کے تاریخی شعور کو یوں رقم کرتے ہیں:

> ''جدید اردو نظم میں مختار صدیقی کی فکری اساس کا اختصاص، تاریخ کا گہرا شعور اور بصیرت ہے۔ صدیوں کو محیط تہذیب آثار اور وقت کے لامحدود آنات کے شکار تمدنی نشانات کو ایک چشمِ حیرت سے مختار صدیقی نے دیکھا اور اپنی نظم میں کمال تمثالوں کے ساتھ پیش کیا۔''۹

مختار صدیقی کے تاریخی وتہذیبی شعور میں ایک تسلسل بھی نظر آتا ہے۔ اس تسلسل میں وہ مختلف زمانوں اور مختلف نسل کے انسانوں کو دیکھتے ہیں جو تاریخ کے ہر دور میں مٹ کر ابھرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہیں:

یعنی تاریخ کے ہر موڑ پہ ہم نے جانا
خاکبازی میں نواسازی ہی رہنا ہوگا
اور ہر اہلِ نظر صاحبِ فرد کے طفیل
ابھی زندانی آغاز ہی رہنا ہوگا۱۰

مختار صدیقی کے ہاں ہندی روایات، رسم ورواج اور کردار بھی نظر آتے ہیں۔ مختار صدیقی کی نظر ہندی سماج کے مسائل پر ہی نہیں تھی بلکہ ہندی تہذیب سے لگاؤ بھی تھا۔ ہندی زبان سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ اور ہندی تہذیب سے لگاؤ کے باعث تہذیب کے کھوج میں وہ موہن جوداڑو اور ٹھٹھہ کے کھنڈرات تک پہنچ جاتے ہیں۔ مختار صدیقی تہذیب اور زمین دونوں سے بہت مضبوطی سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندی زبان، دیومالا، تہذیب، تاریخ اور تصوف سے لگاؤ یہ تمام عوامل ان کی اپنی سرزمین سے محبت کی نشان دہی کرتے ہیں:

میرے چاند آؤ، رچاؤ ساری سکھیوں سنگ راس
میری رادھا آؤ بھی

جی کے شیشل گات میں اِک اِک سجیلے رنگ میں
ہوں سدا رنگ آب رنگینے پہ بت اس کے پیار میں
میری رادھا آ ؤ بھی
میری پیاری میری راتوں کی نویلی چاندنی!۱۱

مختار صدیقی نے تاریخ وتہذیب سے جڑے عناصر کو موسیقی اور راگوں کے توسط سے بھی پیش کیا۔ وہ اپنے معاصرین اور حلقے سے اس لیے بھی منفرد نظر آتے ہیں کہ ان کے خیالات صرف لفظوں میں ہی نہیں ڈھلتے بلکہ اپنے اظہار کے لیے سُروں کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی سے شاعر کا اس قدر لگاؤ اس کے ہاں ماضی سے محبت اور اصول وضوابط کی پابندی کی خواہش کی غمازی بھی کرتا ہے۔ مختار صدیقی معاشرے کی طرح فن کو بھی کچھ اقدار کی پاسداری سکھانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں معریٰ اور آزاد نظم بہت بعد میں آئیں اور انھوں نے پابند ہیئتوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ راگ راگنیوں کا استعمال کیا۔

لب پہ آ جاتے ہیں سنگیت ہمارے ساقی
ولولے دل کے اگر غم سے سنورنا سیکھیں
وہ زباں ۔۔جو ہے شفق، پھول ستارے ساقی
ہم بھی پا لیتے ہیں گر زندگی کرنا سیکھیں ۱۲

مختار صدیقی سُروں اور راگوں کے ساتھ متخیلہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرنوں سے پہلے تخلیق کیے جانے والے ان راگوں کو اسی تہذیب وتمدن کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ''راگ درباری'' جس کا تعلق بادشاہوں اور درباروں سے ہے اس کے پس منظر میں اکبر کا دربار نظر آتا ہے اور اس نظم میں راگ کے مختلف حصوں میں مغل تہذیب، ان کی تعمیرات، ان کے ذوق، اور عروج وزوال کو پیش کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں وہ اس راگ کے حوالے سے تین صدیوں کے سفر کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان صدیوں میں وہ مغل تہذیب و تمدن دیکھتے ہیں۔ فتح پور سیکری کے محل کی محرابیں اور کشادہ ایوان ان کی نظروں میں گھوم رہی ہیں جہاں اکبرِ اعظم کا جلوس ہے۔ وہ قاری کو محل کا پورا نقشہ اور دربار کا منظر دکھاتے ہیں۔ انترہ میں وہ آل تیمور کی حکومت کے پھیلاؤ، ان کے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرتے ہیں۔ راگ کے پھیلاؤ میں اکبرِ اعظم کی شان وشوکت، مغلیہ سلطنت کے عروج اور پھر زوال کو پیش کرتے ہیں۔ آخر میں اداسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور راگ

اسی غمگین کیفیت پر ختم ہو جاتا ہے۔شاعر اداس اور غمگین ہو جاتا ہے اس کی نظروں کے سامنے محلات کے کھنڈرات ہیں جو ویرانی اور زوال کی کہانی سنا رہے ہیں۔

بیکراں رات سے محراب کی رفعت دونی
اور میں سایۂ محراب میں ہوں افتادہ
خشک خندق سے ادھر کوہِ گراں دیواریں
اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ نشانِ جادہ
کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری؟!۱۳

مختار صدیقی کے ہاں ہندی روایات، رسم ورواج اور کردار بھی نظر آتے ہیں۔عورتوں کے حوالے سے ہندی سماج میں رائج رسم ورواج کو انھوں نے نظم ''رسوائی'' کا موضوع بنایا ہے۔اس نظم میں ستی کی رسم کے حوالے سے عورت کے جذبات و احساسات کو پیش کیا ہے جس کو جیتے جاگتے زندہ جلا دیا جاتا ہے۔''زوال''، ''بازیافتہ''، ''اور نزعِ مسلسل'' میں بھی عورتوں کے ساتھ سماجی امتیاز کے رویے کی طرف اشارہ کیا ہے۔مختار صدیقی کی نظر ہندی سماج کے مسائل پر ہی نہیں تھی بلکہ ہندی تہذیب سے لگاؤ بھی تھا۔ہندی زبان سے بھی خاص دلچسپی تھی اور ہندی تہذیب سے لگاؤ کے باعث تہذیب کے کھوج میں وہ موہن جوداڑو اور ٹھٹھہ کے کھنڈرات تک پہنچ جاتے ہیں۔مختار صدیقی تہذیب اور زمین دونوں سے بہت مضبوطی سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ہندی زبان، ہندی دیومالا، تہذیب، تاریخ اور تصوف سے لگاؤ یہ تمام عوامل اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اپنی دھرتی اور مٹی سے جڑے ہیں اور اس کی کشش کو محسوس کرتے ہیں۔ڈاکٹر ملک حسن اختر لکھتے ہیں:۔

''۔۔۔انھوں نے ہندی شاعری سے کافی اثر قبول کیا ہے چنانچہ ان کی شاعری میں ہندی شاعری کا لب ولہجہ اور ہندی کے مترنم اور رسیلے الفاظ ملتے ہیں۔انھیں موسیقی سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کی وجہ سے انھوں نے نظم میں صوتی آوازوں کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا تجربہ کیا ہے۔''۱۴

مختار صدیقی نے سی حرفی کی صنف کا انتخاب اس لیے بھی کیا کہ مقامی اصناف کی طرف ان کی رغبت زیادہ تھی۔تصوف میں بھی فارسی روایت کی طرف دیکھنے کی بجائے پنجابی روایت کی طرف متوجہ ہوئے۔فارسی کی صوفی روایت زندگی کی بے ثباتی پر زیادہ توجہ دیتی ہے جب کہ پنجابی تصوف زندگی سے بھر پور نظر آتا ہے۔مختار صدیقی کی سی حرفی کے مضامین میں ابھی کہیں زندگی کی بے ثباتی اور مایوسی نظر نہیں آتی بل کہ وہ زندگی

کے ہر پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور بھرپور زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جو عشق و محبت سے لبریز ہو۔حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

> ''مختار صدیقی کی سی حرفی میں شامل موضوعات ان کی میلان طبع کا نتیجہ نظر آتے ہیں۔اس میں پنجاب کی روایات کے تتبع میں اخلاقی مضامین یا محض تصوف کا التزام نہیں کیا گیا۔وہ ایک ہی ''حرف'' کے لیے ایک سے زیادہ قطعات کو لاتے ہیں جس کا مقصد اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی وسعت بتانا ہے''۱۵

مختار صدیقی نے تاریخ اور تہذیب کے باطن سے اپنی ذات کو کھوجنے کی بھی سعی کی وہ اپنی روح اور اپنے باطن کے لیے آسودگی اور اطمینان کے متلاشی تھے۔ایسی آسودگی جوان کے دور کے خلفشار اور انتشار میں ممکن نہیں تھی تاریخ کے جھروکے وا کر کے ہی ان پر ایسی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں جو ان کے باطنی اضطراب کو قرار دے سکیں۔پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:۔

> ''اپنے فنی سفر کے آغاز میں ہی انھیں یہ احساس تھا کہ ان کی ذات جس تہذیبی پس منظر سے نمو حاصل کر سکتی ہے اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے قوم کی تہذیبی انفرادیت کی بازیافت کے بغیر عرفانِ ذات کی منزل پر پہنچنا دشوار ہے۔''۱۶

مختار صدیقی نے اپنے معاصرین سے مختلف انداز اختیار کیا۔موسیقی اور تاریخ کو بنیاد بنا کر معاصر صورتِ حال کو پیش کیا۔ وہ تاریخ کے واقعات کو لمحہ موجود میں لا کر ان کی معاصر سماجی و تہذیبی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔وہ زندگی میں محبت، حسن اور مثبت رویوں کے متلاشی تھے۔وہ مقامی تہذیب اور رسم و رواج کو مغربی تہذیب پر فوقیت دیتے تھے۔زندگی کے انتشار اور کش مکش میں وہ ٹھہراؤ اور سکون کے خواہاں تھے، اور اسی سکون کی تلاش میں وہ بار بار ماضی کی طرف جاتے ہیں اور تاریخ کے جھروکوں سے زندگی کے حُسن اور خوب صورت انسانی قدروں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر کوثر مظہری کے مطابق:۔

> ''کسی بھی شاعر کے اندرون میں اس کا لسانی اور فکری شعور ہم آہنگ ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار شعری سطح پر ہوتا ہے۔تخلیقی فن پارہ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ کوئی شاعر اپنے اندرون میں کس تہذیبی اور لسانی یا فکری ہم آہنگی کے ساتھ زندہ ہے۔''۱۷

مختار صدیقی جب تاریخ کے ورق الٹ کر تین سو برس پیچھے چلے جاتے ہیں تو وہاں بھی ان کا قاری اجنبیت محسوس نہیں کرتا کیوں کہ وہ پس منظر تین سو برس پرانا ہے لیکن قاری کو اس میں اپنی کہانی کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔وہ کھنڈرات میں دفن مردہ ماضی کا ذکر نہیں کرتے بل کہ اس ماضی کو لمحہ موجود کے ساتھ اس

طرح مربوط کر دیتے ہیں کہ اس میں اجنبیت کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔تشبیہ،استعارہ اور علامت عموماً شاعری کا حسن خیال کیے جاتے ہیں اور شاعری کا یہ پیرایہ اظہار بھی انہی سے تخلیق پاتا ہے مختار صدیقی نے اپنے لیے مختلف پیرایہ اظہار منتخب کیے لیکن شاعری کی اثر پذیری اور حسن کے ساتھ ساتھ ابلاغ کو متاثر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی شاعری کو لفظوں کا گورکھ دھندا بنا کر اس میں الجھانے کی کوشش کی۔

؎ آگ اور خاک کا ربط عجب ،کبھی لاگ رہی ،کبھی میل رہا
آگ ہی خاک کو منکر سجدہ ،آگ ہی باغِ بہاراں تھی !
آگ کے کھوج میں خاک پیمبر ،ایسا ہی تیرا کھیل رہا !
آگ مغانِ کہن کی بجھی ،جب ایک تجلی انسان تھی ۱۸

مختار صدیقی کے نزدیک کسی بھی تاریخی واقعے ،حادثے کے تخلیقی اظہار کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے انقلابات اور حادثات انسانی ذہن کو بہت متاثر کرتے ہیں۔کسی واقعے کے رونما ہونے کے فوراً بعد رپورتاژ یا خبر لکھی جاسکتی ہے اس واقعے کے اثرات کو نظم میں ڈھالنے کے لیے ذہن کو سنبھلنے کا وقت درکار ہوتا ہے اور کچھ وقت کے بعد ہی واقعے کے متعلق اپنے انداز سے کچھ تحریر کیا جا سکتا ہے۔گویا مختار صدیقی کے نزدیک ادب کو سطحیت سے دور رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کسی خارجی تجربے کو اپنی ذات میں رچ بس جانے کا موقع دے۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت سعید، *اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک*، (لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)ص ۲۵۰۔
۲۔ مختار صدیقی، *منزلِ شب*، (لاہور: نیا ادارہ،۱۹۵۵ء)،ص ۵۷۔
۳۔ مظفر علی سید *سخن اور اہلِ سخن* (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء)،ص ۲۲۲۔
۴۔ صفدر میر *بیابانِ جنوں* (لاہور: کلاسک،۱۹۹۷ء)،ص ۶۸۔
۵۔ ایضاً،ص ۶۷۔
۶۔ مختار صدیقی،منزلِ شب،ص ۱۳۲
۷۔ ایضاً،ص ۱۱۶۔
۸۔ مظفر علی سید،ص ۲۲۴۔
۹۔ طارق ہاشمی، *اردو نظم اور معاصر انسان* (اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)،ص ۱۰۱۔

۱۰۔ مختار صدیقی، ص۵۹۔
۱۱۔ ایضاً، ص۸۳۔
۱۲۔ ایضاً، ص۶۹۔
۱۳۔ ایضاً، ص۷۶۔
۱۴۔ ملک حسن اختر، *تاریخ ادب اردو* (لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۶ء) ص۴۷۶۔
۱۵۔ حمیرا اشفاق، *مختار صدیقی نوکلاسیکی روایت کا ترجمان*، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص۳۷۔
۱۶۔ فتح محمد ملک *تعصّبات* (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص۳۰۸۔
۱۷۔ کوثر مظہری، *جدید نظم حالی سے میراجی تک*، (لاہور، گنج شکر پریس، ۲۰۱۵ء) ص۴۱۰۔
۱۸۔ مختار صدیقی *سہ حرفی*، (کراچی، مکتبہ زاد، ۱۹۶۳ء